مارکسی تثلیث

(از: چوہدری علی احمد خاں مرحوم)

[چوہدری علی احمد خاں مرحوم و مغفور تحریک اسلامی کے صفِ اوّل کے کارکن تھے۔ اس ملک میں احیائے اسلام کی جب کبھی تاریخ مرتب کی جائے گی تو وہ چودھری صاحب مرحوم کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے ذکر سے کبھی خالی نہ ہوگی۔ اُن کی پرکشش شخصیت، وسعتِ علمی اصابتِ رائے، سیاسی فہم و فراست اور مقصد کے ساتھ والہانہ عشق کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اشتراکیت پر ان کی نظر خصوصاً بڑی گہری تھی۔ ابھی اُن کی تصنیفی صلاحیتیں ابھر ہی رہی تھیں کہ مالک الملک کا بلاوا آگیا اور وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ زیرِ نظر مضمون اُن کے نوٹس سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف اشتراکیت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہونگی بلکہ اپنے ایک مخلص رفیقِ کار کی یاد بھی تازہ ہوگی۔ ع۔ ح ص]

اشتراکیت کے بارہ میں عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ محض ایک اقتصادی نظام ہے۔ جس کا تعلق انسان کے معاشی مسائل کے علاوہ اور کسی معاملہ سے نہیں ہے۔ اس لیے بعض اوقات سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک معاشرہ کا خواہ کوئی بھی مذہب ہو، کوئی نظامِ اخلاق ہو، کوئی سیاسی ہیئت ہو۔ لیکن اگر وہ اشتراکیت کا تجویز کردہ معاشی نظام اپنا لے تو پھر کمیونزم اس کے سامنے مزید کوئی مطالبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی مادی برکات کے ثمرات سے اس کی جھولی بھر دیتا ہے۔ اس تصوّر نے بعض عجیب و غریب غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کو اپنی جگہ علیٰ حالہ قائم رکھتے ہوتے اگر صرف مارکس کی پیش کردہ معاشی تجاویز پر عمل پیرا ہو جائیں تو انہیں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی حاصل ہو جائے گی۔ جنتِ ارضی کے وہ

کمیونزم کو اختیار کرنے کی وجہ سے حقدار ہونگے اور فلاح آخرت اسلام کی وجہ سے اُن کے حصے میں آئیگی۔ اس طرح دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہونگے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ تصورات کا یہ تار و پود خود فریبی پر مبنی ہے یا اُس ذہنی افلاس پر، جو اسلام اور کمیونزم دونوں ہی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اس حالت میں بہتر یہ ہوگا کہ خود اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے کہ اس کا پیش کردہ کمیونزم کیا ہے؟

مارکس کے کمیونزم کی بنیاد تین اصولوں پر ہے (۱) جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM (۲) طبقاتی نزاع (CLASS STRUGGLE) اور (۳) قدر زائد (SURPLUS VALUE)

اس باب میں انہیں تینوں اصولوں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے

۱۔ جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM: اس نظریہ کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کی تاریخ۔ اس کی ابتدا اور اس کے آغاز کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کیا یہ سب کچھ مارکس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا دوسرے لوگوں کی خوشہ چینی۔

جدلیت (DIALECTICS) یونانی لفظ DIALEGO سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بحث کرنا۔ پرانے زمانہ میں کسی شے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے بحث و تمحیص کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ہر صاحبِ عمل مخالف کے دلائل کا تضاد واضح کر کے ان کی تردید کرنے کی کوشش کرتا۔ اس دور کے حکماء کا خیال تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی کے لیے خیالات کے تضاد کو نمایاں کر کے مخالف کی غلطی واضح کی جا سکتی ہے[۱]۔

ہیگل اور کانٹ کے بعد آنے والے دوسرے حکماء نے اس طرز جدلیت کو خود فطرت کے کارخانۂ ہست و بود کی حقیقت سمجھنے کے لیے استعمال کیا۔ ان کے نزدیک اِس عالمِ کون و مکان اور تجربہ گاہِ عالم میں شکست و ریخت اور تعمیر و تخریب کا سلسلہ زبانِ حال سے مصروف بحث و جدال ہے۔ خود "حقیقت" REALITY ہی نے یہ کاروبار جاری کر رکھا ہے۔ اس کا ایک فرقی منطقی دعویٰ۔

۱؎ PROBLIMS OF LENINISM T. STALIN P.570

(LEGAL THESIS) ہے اور دوسرا فریق منطقی جواب دعویٰ (LOGICAL ANTITHESIS) ہے۔ اس بحث و تمحیص اور کش مکش کے بطن سے ایک ایسی ”ناقابلِ فنا حرکت“ جنم لیتی ہے۔ جو ایک بلند ”امتزاج“ SYNTHESIS کی طرف گامزن ہے۔ ہیگل کے نزدیک اس جدلی حرکت کی منزلِ مقصود خدا یا روحِ مطلق ہے۔

ہیگل کا فلسفۂ جدلیت | ہیگل کہتا ہے کہ انسانیت کے مختلف ادوار میں تہذیب و تمدن کے جو مختلف مظاہر نظر آتے ہیں یہ سطحِ مدنیت پر خود رو پودوں کی طرح یونہی بغیر کسی منصوبے کے نمودار نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے زمانہ کی ”روحِ عصر“ کے نہایت ہی مربوط برگ و بار ہیں جو اپنی اصل سے اُسی طرح معلق ہیں جس طرح کسی درخت کی شاخیں اور پتیاں اس کے تنا سے وابستہ۔ خود ”روحِ عصر“ کیا ہے؟ ہیگل کے نزدیک یہ وہ چراغ ہے جس کی روشنی سے زندگی کے مختلف پہلو منور ہوتے ہیں۔ یہ وہ تنا ہے جس سے شجرِ تمدن کی مختلف شاخیں نمودار ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر تمدن کے مختلف شعبوں کا اس کے اصل سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ نہر اور اس کی شاخوں کا اصل دریا سے ہوتا ہے۔ دریا میں جس قسم کا پانی ہوتا ہے اس کی مخصوص صفات نہروں کی آخری شاخ تک ہر قطرہ میں نمایاں ہوتی ہیں۔ معاشرہ میں تصور کی یہی پوزیشن ہے۔ ہر دور کے معاشرہ میں کوئی نہ کوئی غالب تصور کارفرما ہوتا ہے۔ اس تصور ہی کی روح ہوتی ہے جو اس وقت کے نظامِ زندگی کے تمام شعبوں میں اسی طرح جاری و ساری ہوتی ہے جس طرح انسانی جسم کی رگوں میں گردشِ خون۔ چنانچہ زندگی کے تمام شعبوں مثلاً اخلاق، مذہب، معیشت و سیاست۔ معاشرت و تمدن کا ہیولیٰ یہی ”روحِ عصر“ تیار کرتی ہے۔ جب یہ غالب تصور اپنے اوجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس ”تصور“ (IDEA) یا روحِ عصر (SPIRIT OF THE AGE) کے بطن سے ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے کارفرما تصور کی عین ضد ہوتا ہے۔ یہ تصور اس ماحول میں نشو و نما پاتا ہے۔ اس کے مفید اور بہتر عناصر جذب کرتا ہے اور سنِ شعور کو پہنچ کر غالب تصور سے پنجہ آزمائی شروع کر دیتا ہے۔ اس جنگ و جدل میں کارازرفتہ تمدن اپنے وسائل و تجربات کے تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر آتا ہے۔

لیکن نیا "تصور" نئے خون، تازہ جوش اٹھتی ہوئی امنگوں اور اُبھرتے ہوئے جذبات کی لہروں اور موجوں کے تھپیڑوں سے پرانے اور فرسودہ نظام کو شکست دیکر پیوندِ خاک کر دیتا ہے۔ اور "روحِ عصر" کا تاج پہن کر اقتدار کے خالی تخت پر قابض ہو جاتا ہے۔ یہ نیا تصور زندگی کے تمام شعبوں میں اسی طرح سرایت کر جاتا ہے جس طرح شکست خوردہ تمدّن اپنے وقت میں غالب اور مسلط تھا۔ اس جنگ و جدل، تخریب و تعمیر اور بناؤ بگاڑ کا نام ہیگل کی اصطلاح میں "جدلیت" DIALECTIC P ہے۔ اس کے ہر ادا کار کا اُس نے جدا جدا نام رکھا ہے۔ کارفرما "تصور" کو وہ دعویٰ (THESIS) کہتا ہے۔ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی اس کی ضد کو وہ جوابِ دعویٰ (ANTI THESIS) کا نام دیتا ہے۔ اور اس جنگ کے بعد غالب آنے والا تصور امتزاج (SYNTHESIS) کہلاتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک میدانِ تمدن میں یہ جنگ و جدال اور کشت و خون کسی بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی نہیں۔ بلکہ حقیقت میں یہ ایک باشعور طاقت کا مقررہ پروگرام ہے جس کے مطابق یہ سب کچھ انجام پا رہا ہے۔ وہ ہستی کون سی ہستی ہے جو ہماری آنکھوں سے مستور مگر کارفرما ہے۔ ہیگل کہتا ہے وہ خدا ہے۔ وہ روحِ مطلق ہے۔ وہی طاقت اس کارخانہ ہست و بود کو معرضِ وجود میں لائی۔ وہ ایک مقررہ مقصد، ایک طے شدہ پروگرام اور ایک واضح سکیم کے تحت اس تماشہ گاہِ عالم کو منزلِ مقصود کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے ذہنِ انسانی کو آلۂ کار بنایا ہے اور اُسے دعویٰ، جوابِ دعویٰ کی کشمکش میں مبتلا کر کے اُسے آگے بڑھنے کی ہمت اور توفیق عطا کی۔

کارل مارکس کا نظریہ ہیگل کے اس فلسفہ سے مارکس نے جدلیت کا نظریہ تو لے لیا لیکن اور دو معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ ایک تو ایسی غیبی ہستی کے وجود میں جو نظروں سے اوجھل ہے اور خالقِ ارض و سماء کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی خدا۔ اور دوسرے تصور کو مادہ سے ایک علیحدہ وجود سمجھا۔ اس کے برعکس کہتا ہے کہ نہ تو کوئی خدا ہے جس نے زمین وغیرہ کو پیدا کیا ہو اور نہ ہی

"تصور" مادہ سے جدا وجود رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر شے کا اصل مادہ ہی ہے۔ کیوں کہ مادہ ہی جب کمیت کی بجائے کیفیت کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے تو فکر کہلاتا ہے۔ لہٰذا یہ "فکر" اپنی اصل اور نوعیت کے لحاظ سے غیر مادی نہیں بلکہ مادی ہے۔ اس تشریح کے بعد مارکس جدلیت کے ڈھانچہ سے "تصوریت اور عینیت" کی حقیقت کو نکال کر اس میں "مادیت" کی "روح" بھر دیتا ہے۔ چنانچہ اس "جدلیت" کا نام اس نے جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM رکھا ہے۔ خود مارکس کے الفاظ میں سنیے:

"میرا تصور جدلیت نہ صرف یہ کہ ہیگل کے تصور سے مختلف ہے۔ بلکہ اس سے بالکل ہی متضاد ہے۔ ہیگل ذہنِ انسانی کی تگ و تاز اور فکر و جستجو کو تصور (IDEAL) کے نام سے موسوم کر کے اُسے ایک تو جداگانہ اور مستقل بالذات حیثیت عطا کرتا ہے۔ اور دوسرے اس دنیا کا خالق قرار دیتا ہے۔ اور اس ٹھوس اور حقیقی دنیا کو اُسی "تصور" کا پیکرِ محسوس بتاتا ہے۔ میرے نزدیک حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ یہ کہ (IDEAL) تصور فی نفسہٖ مادی دنیا کی اُس عکاسی کے سوا کچھ نہیں، جو ذہنِ انسانی کے وظیفۂ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور جسے اس نے فکر کے قالب میں ڈھالا ہے"[1]

مارکس کا رفیق اینجلز (ENGELS) لکھتا ہے۔

"فطرت کے مادی نظریہ کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اُسے بغیر کسی بیرونی مداخلت کے جوں کا توں تصور کر لیا جائے"[2]

اب مارکس کے شاگردِ رشید لینن کا بیان سنیے جس نے اس فلسفہ کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کیا۔ ماضی کے ایک مفکر ہرقلیط (HERCLITUS) کے مادی نقطۂ نظر کو سراہتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ہرقلیط نے جدلی مادیت کے بنیادی اصولوں کی نہایت اچھی تشریح کی ہے۔

---

[1] KARL MARX CAPITAL VOL I P.30

[2] STALIN PROBLEMS OF LENINISM P. 79

ہرقلیطس کے جس نظریہ کی تعریف میں لینن اس طرح رطب اللسان ہے وہ یہ ہے :

"دنیا من حیث الکل نہ تو کسی خدا کی تخلیق ہے اور نہ کسی انسان کی، بلکہ ماضی، حال اور مستقبل کی ایک زندہ شعاع ہے۔ جو ایک خاص ضابطہ کے تحت روشن ہوتی ہے اور پھر مدھم پڑجاتی ہے۔"

مارکس ہیگل کے اس نظریہ پر کہ کوئی غیر مادی طاقت بھی موجود ہے۔ جو اس کائنات کی علتِ تخلیق ہے، رہ رہ کر اعتراض کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک "ہیگل خواب وخیال کی دنیا میں رہنے والا انسان تھا۔ تصورات کی نوعیت تجریدی نہ تھی بلکہ اس کے برعکس اشیاء اور ان کا نشوونما اس کے خیال میں ایسے خیالات کا پرتو تھا جنہیں عالم محسوسات سے ہی مستعار لیا گیا تھا۔ خود "تصور" بھی اس کے (ہیگل) نزدیک ایک ایسا وجود تھا جو کہیں نہ کہیں دنیا کی تخلیق سے قبل ہی موجود تھا۔"

پھر لکھتا ہے :

"دنیا کی وحدت کا انحصار اس کے وجود پر موقوف نہیں ہے . . . بلکہ حقیقی یک جہتی اس کی مادیت کی رہینِ منت ہے . . . فلسفہ اور طبیعیات کی لمبی چوڑی اور اکتا دینے والی بحثیں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ حرکت مادہ کی ہی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مادہ تو ہو لیکن حرکت کے بغیر۔ یا حرکت تو ہو لیکن مادہ کے بغیر . . . پھر اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ تصور وشعور کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بلاشبہ ہے تو ذہنِ انسانی کی ہی پیداوار لیکن خود انسان کی تخلیق فطرت کی رہینِ منت ہے۔ اور وہ مادی دنیا کے اندر ہی نشوونما پاتا ہے۔ لہٰذا یہ واضح رہے کہ ذہنِ انسانی جو کہ بالآخر فطرت ہی کی پیداوار ہے فطرت کے دوسرے مظاہر سے متصادم ہونے کی بجائے اُن سے موافقت رکھتا ہے۔"

ان تشریحات سے واضح ہو گیا کہ مارکس کس چیز کی نفی اور کس کا اثبات کرتا ہے۔ وہ ایک تو اس چیز کو ماننے سے انکار کرتا ہے کہ کوئی غیر مرئی ذات یا علیٰ طاقت، خدا وغیرہ موجود ہے۔

جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہو۔ یا جس کے حکم اور منشا سے یہ کارخانہ قدرت چل رہا ہے۔ دوسرے وہ اس بات سے بھی انکار کرتا ہے کہ "تصور" یا "خیال" جسے ہیگل ایک مستقل بالذات حیثیت عطا کرتا ہے فی الواقع مادہ سے جدا اور علٰحدہ ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اصل حقیقت مادہ ہے۔ کائنات کی تخلیق اسی کی رہینِ منت ہے۔ اسی کی حرکت سے کائنات کے مختلف مظاہر کے درمیان وحدت پیدا ہوتی ہے۔ زمین پر مختلف انواع کی گلنوع اشیاء اصل میں مادہ ہی کے لباس کمیت کا مظاہر ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ "خیال"، "تصور"، "شعور" وغیرہ بھی مادہ کے لباس کیفیت کے وظیفۂ فطری کی تخلیق ہیں۔ لہٰذا نہ تو کوئی خدا ہے اور نہ کوئی دوسری غیبی طاقت۔ کائنات کی تخلیق اور جو کچھ اس پر ہے سب مادہ کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی تصور کائنات کا نام مارکس نے مادیت رکھا ہے۔

جدلیت اوپر بیان ہو چکا ہے کہ قدیم زمانہ میں اہلِ یونان جدلیت کے ذریعہ متضاد دلائل کی چھان پھٹک اور بحث و تمحیص سے حقیقت کا علم حاصل کرتے تھے۔ ہیگل نے تجربہ گاہِ عالم میں فطرت کی شکست و ریخت اور تخریب و تعمیر کو اسی جدلیت کے طرز پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ متضاد تصورات و خیالات" بحث و جدال میں الجھے ہوئے حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں"۔ مارکس نے جدلیت کا ڈھانچہ تو ہیگل سے مستعار لیا اور اس کے اندر سے عینیت (IDIALISM) کا جوہر نکال کر اس میں مادیت کی روح بھر دی۔ پھر اس مرکب کا نام جدلی مادیت (OBJECTIVE MATERIALISM) رکھا۔ اس سے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مظاہرِ فطرت ہر لحظہ تغیر پذیر ہیں۔ فطرت کے اندر مختلف عناصر برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی یہ باہمی کشمکش اور فطرت کی تکمیل ان ہی متضاد عناصر کے تعامل کی مرہونِ منت ہے۔

لہٰذا اس لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہونے والی دنیا میں جدلیت کے نقطۂ نظر سے کوئی چیز ایسی نہیں جو مکمل ہو۔ ہر شے میں سقم ہے۔ ہر بات میں کمی ہے۔ کوئی چیز نہیں جو حرفِ آخر ہو۔ کوئی اصول اور کوئی قدر نہیں جس کے وجود کو مقدس قرار دیا جا سکتا ہو۔ اس فلسفہ کی رو سے

ہر شے اپنی سرشت اور نوعیت کے لحاظ سے وقتی اور عبوری ہے۔ یہاں کسی کو بھی قرار نہیں۔ ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور ترقی کی منزل کی طرف گامزن۔

مارکس عینیت (IDIALISM) کے برعکس جو دنیا کو ایک "تصورِ مطلق" یا "روحِ عالم" یا "شعور" کا مظہر قرار دیتا ہے مارکسی جدلیت کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا کسی تصورِ مطلق یا روحِ عالم کے تصور یا شعور کے سانچے میں ڈھلا ہوا مادی پیکر نہیں، بلکہ فی نفسہٖ

(۱) اپنے جوہر، اپنی روح اور حقیقت کے لحاظ سے مادی ہے۔

(۲) اس کے بے شمار مظاہر اصل میں مادہ کی حرکت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

(۳) ان مختلف مظاہر کا آپس میں ربط اور ایک دوسرے پر انحصار مادہ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ جس کے مطابق دنیا ارتقاء کی منزلیں طے کر رہی ہے لہٰذا یہ کسی روحِ مطلق کی محتاج نہیں ہے۔

تاریخ کا مادی نظریہ | مارکس کا یہ نظریہ تو بیان کیا جا چکا ہے کہ مختلف مظاہرِ فطرت کا آپس میں ربط و ضبط اور ایک دوسرے پر انحصار دراصل کتابِ ارتقاء کے وہ قواعد اور روداد سفر کے وہ ضوابط ہیں جن کے تحت متحرک مادہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھانے سرگرم عمل رہتا ہے۔ یہ ضوابط کیا ہیں؟ کیا ان کا اطلاق معاشرتی معاملات پر بھی ہو سکتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کیسے اور کس طرح؟ اس کے نتائج کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ مارکس کہتا ہے ان معاملات کا اگر جدلی مادیت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح مظاہرِ فطرت کا ایک دوسرے سے رشتہ و تعلق اور ایک دوسرے پر انحصار مادی قوانین کی غمازی کرتا ہے بعینہٖ تمدنی معاملات میں معاشرتی تعلقات کا سلسلہ اور ربط و ضبط بھی معاشرتی قوانین کی نشاندہی کرتے ہیں۔

شالن اس کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"جب مظاہرِ فطرت کے درمیان ربط و ضبط اور ان کا آپس میں ایک دوسرے پر انحصار ارتقائے فطرت کا ضابطہ ہے تو اس سے خود بخود یہ مطلب بھی اخذ ہو جاتا ہے کہ معاشرتی زندگی

میں رنگا رنگ مظاہر کا باہمی تعلق بھی تمدنی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ جب معاشرتی زندگی کے مظاہر کا آپس میں تعلق اور ایک دوسرے سے ربط سوسائٹی کے ارتقاء قانون کا مظہر ہے۔ اس قانون کے تحت جب تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو تاریخ "حادثات" و "اتفاقات" کے ایک دفترِ بے معنی کی بجائے سوسائٹی کے تدریجی ارتقاء کا سفرنامہ بن جاتی ہے۔ جس کا مطالعہ فی نفسہٖ ایک علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر یہ علم اتنا ہی درست اور صحیح ہوتا ہے جتنا کہ دوسرے علوم۔ اس کے قوانین سے معاشرتی حالات کے سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے، بلکہ یہ وہ کلید ہے جس سے تاریخ کے مغلق باب کھل جاتے ہیں لہٰذا دنیا میں تعمیر و تخریب کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، اقدارِ حیات میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، فکر و نظر کے زاویے جس طرح بدل رہے ہیں، زندگی کے مختلف نظاموں میں شکست و ریخت کا جو سلسلہ جاری ہے وہ سب ان ہی اصولوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ ان قوانین کی روشنی میں تاریخ کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرتی انقلابات جن کو تاریخ دانوں نے کسی وقتی ہنگامہ، عارضی جذبات، کسی انقلابی شخصیت کے انقلابی نظریات کا مرہونِ منت قرار دیا ہے۔ دراصل معاشرتی انقلابات کے مقررہ سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں جو (۱) نہ تو کسی خاص شخص کے نظریات، خدائی ہدایت، کسی غیبی مقتدر اعلیٰ کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ (۲) نہ ہی وقتی حالات، ہنگامی جذبات کے آتش فشاں سے پھوٹنے والا لاوا ہے۔ اور (۳) نہ نسلی و خاندانی، قومی، شخصی و ملی جھگڑوں کے خونی نتائج بلکہ اپنے اپنے وقت کے معاشرتی تعلقات سے پیدا ہونے والے ثمرات ہیں۔ کیونکہ اصل تو معاشی تعلقات ہی ہوتے ہیں جو کسی دور کے افکار و نظریات کو جنم دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی انقلاب کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ان معاشی اصولوں ہی کا کھوج لگانا پڑے گا۔ سٹالن اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"اگر فطرت، وجود اور مادی دنیا کی حیثیت مقدم ہے۔ اور ذہن و خیال کا مقام ثانوی اگر مادی دنیا کا وجود خارجی (OBJECTIVE) ہے۔ اور انسانی ذہن سے جدا اس معروضی (OBJECTIVE) حقیقت کا عکس، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاشرہ کی مادی زندگی

اور اس کا وجود بھی مقدم اور اس کی روحانی زندگی ثانوی۔ نیز معاشرہ کی مادی زندگی انسانی ارادہ سے آزاد ایک خارجی حقیقت ہے تو معاشرہ کی روحانی زندگی اس معروضی حقیقت کا عکس اور اس کے وجود کا پرتو ہے۔"

لہٰذا معاشرہ کی روحانی زندگی کی تشکیل کا منبع اور معاشرتی خیالات، نظریات، سیاسی تصورات اور اداروں کا سرچشمہ فی نفسہٖ ان خیالات، نظریات، تصورات اور سیاسی اداروں میں تلاش کیا جاتا ہے بلکہ معاشرہ کی مادی زندگی کے حالات اور اس کے معاشرتی وجود میں ڈھونڈا جائے۔ کیونکہ یہ خیالات، تصورات، نظریات اور ادارے وغیرہ۔ ان (معاشرہ کی معاشی زندگی کے حالات اور اس کے معاشرتی وجود) ہی کا پرتو ہیں۔"

اگر تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف معاشرتی خیالات، نظریات، تصورات، اور سیاسی اداروں کو سمجھنا مقصود ہے . . . . تو ان کا حقیقی علم خود ان خیالات، نظریات، تصورات اور سیاسی اداروں کی "نوعیت" اور "خصوصیت" سے معلوم نہیں ہو گا۔ بلکہ تمدنی ارتقاء کے مختلف ادوار کی مادی زندگی کے مطالعہ سے حاصل ہو گا۔"

پھر آخر میں لکھتا ہے: "سوسائٹی کے افراد کے مابین جس قسم کا معاشی تعلق قائم ہو گا اسی تعلق کے تحت مختلف افکار و نظریات پرورش پائیں گے۔"

اسی نظریہ کی بنا پر مارکس کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں جب بھی انقلابات آئے تو ان کی اصل وجہ وسائلِ پیداوار اور مادی حالات کی تبدیلیوں میں تھی۔ چنانچہ تاریخ کے جن انقلابات کی وجہ مذہبی آویزش، خاندانی سر پھٹول، نسلی تعصبات، فلسفیانہ نظریات یا تصورات کی ادھیڑبن، قوم و وطن یا رنگ و نسل کے اختلافات قرار دی گئی ہے۔ اور بظاہر ان انقلابات پر یہی لیبل چسپاں نظر آتے ہیں۔ اور تاریخ کے صفحات میں ان ہی ناموں کے تحت وجود پذیر ہوئے۔ حقیقتاً ان وجوہات کے نتیجہ میں ظہور پذیر نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کا منبع و مخزن معاشی تبدیلیوں کا وجود ہی ہوتا ہے۔ یہ معاشی تبدیلیاں انسان کے بس کا روگ نہیں۔ یہ خود بخود معرض وجود میں آتی

رہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی حیثیت سیلِ بے پناہ میں خس وخاشاک کی سی ہے جسے معاشی تعلقات کا دھارا جس طرف چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے۔

مارکس نے ایک خط میں انسان کی بے بسی اور بے چارگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے دو سوالات اٹھائے۔ پہلا تو یہ کہ ایک معاشرہ فی نفسہٖ کیا ہوتا ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ افراد کے آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات کا نام معاشرہ ہے۔ جس نوعیت کے تعلقات ہوں گے اُسی نوع کا معاشرہ ہوگا۔ دوسرا سوال وہ یہ کرتا ہے کہ کیا افراد اپنے تعلقات کی نوعیت تبدیل کرنے میں خود مختار ہیں؟ مارکس اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ "ہرگز نہیں"۔ وہ کہتا ہے کہ افراد کے تعلقات کا دارومدار چونکہ اُس وقت کی پیداواری قوتوں کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے اور پیداواری قوتوں کی تخلیق میں ایک معاشرہ آزاد نہیں ہوتا۔ انسان جس معاشرہ میں آنکھ کھولتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک خاص طرز کے معاشی تعلقات میں بندھا ہوا پاتا ہے جس سے اُسے کوئی مفر نہیں۔ اب ہر نئی پیداواری طاقت جسے انسان معرضِ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کے پاس خام مواد صرف وہی پیداواری قوتیں ہیں جو اُس کے پیش رو اس کو عطا کر گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اس پر مجبور ہے کہ نئی پیداوار کے لیے اُسی موادِ خام ہی کو استعمال کرے۔ ظاہر بات ہے کہ جس قسم کا خام مال ہوگا اُسی طرز کی پیداواری قوت معرضِ وجود میں آئیں گی۔ اور جس قسم کی پیداواری قوتیں ہوں گی۔ اُسی نوع کے انسانی تعلقات قائم ہوں گے۔ اور جس قسم کے انسانی تعلقات ابھریں گے اُسی طرز کا معاشرہ قائم ہوگا۔ لہٰذا انسان معاشرہ کے انتخاب میں آزاد نہیں۔ بلکہ مادی جکڑ بندیوں میں بُری طرح بندھا ہوا ہے۔